بعد یہ راحت ہمیں نصیب ہوئی کہ ہمارا بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔

''تمہارا اچھا بھلا کیریئر ہے..... تم اسے کیوں چھوڑنا چاہتے ہو.....'' میں خوفزدہ ہو گیا۔

''میں ..... اچھا ڈاکٹر نہیں ہوں ابا۔ میں Organized نہیں ہوں۔ میری شخصیت Focused نہیں..... میں..... مجھ میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے ..... میں مقابلہ نہیں کر سکتا، نہ کسی فرد کا نہ سوسائیٹی کا، ترقی کا راز مسابقت میں ہے۔ میں ساری عمر سرکاری نوکری کروں گا چھوٹے چھوٹے ہسپتالوں میں ..... کبھی پرائیویٹ کلینک نہ بنا سکوں گا اپنا''۔

''خواہ مخواہ ہم کسی سے کم نہیں۔ میں نے نہ کبھی کوئی ٹٹ پونجیا دوست بنایا نہ کسی غریب رشتہ دار کو پاس پھٹکنے دیا، کس لئے؟ تاکہ تمہارے راستے میں کوئی حائل نہ ہو.....''

''میں پر اعتماد نہیں ہوں.....'' جہانگیر بولا۔

''یہ تم سے کس نے کہا..... تم پڑھائی میں ہمیشہ پہلے چار پانچ لڑکوں میں آتے رہے ہوں..... اگر اعتماد نہ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا.....''

''نہیں ابو..... پڑھائی میں اول، دوئم آنا کوئی معیار نہیں ہے۔ ہر کتابی کیڑا ایسے کر سکتا ہے..... میرے کوئی دوست نہیں۔ میں محفل میں روانی سے پر اعتماد طریقے سے بات نہیں کر سکتا۔ میں سیاست، معیشت، محفلی گفتگو سے نا آشنا ہوں۔ میں اپنی ہی کلاس فیلو کے پروں میں چھپ گیا۔ اس نے کیا آرام سے فائنل امتحان نہیں دیا، لیکن نہ اسے کوئی احساس جرم ہے، نہ ہی اس کے اعتماد میں کمی آئی ..... اب جب ہماری شادی ہوگئی ہے ابو تو میں ہر معاملے میں اس سے ہنٹ لیتا ہوں۔ اس سے کیوں حاصل کرتا ہوں۔ میں کسی معاملے میں اسے کچھ ڈکٹیٹ نہیں کر سکتا۔ جب میں شاہدہ کے گھر فنکشنز پر جاتا ہوں تو میں بالکل Oddman Out ہوتا ہوں۔ پر اعتماد

شخصیت کے لئے جو کچھ درکار ہے۔وہ مجھ میں نہیں ہے۔ابو، مان لیں......وہاں میں الو باٹا محسوس کرتا ہوں۔للو سا۔آپ کی اور بات ہے۔آپ سیلف میڈ آدمی ہیں۔ آپ نے ٹھونک بجا کر زندگی سے دست پنجہ ملا کر زندگی بسر کی ہے۔مجھے تو آپ نے روئی میں لپیٹ کر چوزے کی طرح پالا ہے...... میں کچھ نہیں کر سکتا"۔

میں نے بڑی شفاف، با اصول، پر اعتماد زندگی بسر کی تھی۔میرے ہاتھوں پر سفارش، رشوت، بینکوں کے روپے پیسے کے خرد برد کا کوئی لہو نہیں تھا۔میں ہمیشہ اپنی ہمت اور کام کام کام سے آگے بڑھا۔میں نے نہ کبھی بزنس میں دو نمبر کام کیا، نہ کبھی پی آر کو اپنایا، نہ ہی کسی سیاسی دباؤ، ہتھکنڈے اور ہیر پھیر سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی۔میں ایک ایسا کردار تھا جسے شاید قائداعظمؒ پسند کرتے لیکن اب تو یہ سند بھی قابلِ اعتماد نہ رہی تھی۔اصغری کے سگھڑپنے سے ڈیفنس میں چار کینال کی کوٹھی بن گئی۔تھوڑی سی سیانی، کافی محنتی اور چپ چاپ سی اصغری اور جہانگیر جیسے نیک دل بیٹے کو میں نے حاصل کر لیا تھا۔میرا خیال تھا کہ میں نے اپنی اننگز بڑی شفاف کھیلیں۔لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ زندگی سے جو بھی مائع کشید کریں اس میں تلچھٹ ضرور ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کے گلاس میں یہ درد را مواد بڑھتا جاتا ہے۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں ابو......؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں بیٹے......"

شادی سے پہلے جہانگیر ماں کا لاڈلہ، اکلوتا، من چاہا تھا۔اصغری تو چھپا چھپا کر بعد میں بھی بیٹے کے گرد طواف کرتی رہی، لیکن جہانگیر کے رویے میں سرد مہری آ گئی تھی۔ وہ جہانگیر جو کالج سے واپسی پر ماں کو گود میں اٹھا کر چکر پھیریاں دیا کرتا تھا، کہیں نظر نہ آتا۔وہ سرد مہری سے ماں پر نظر ڈالتا۔اس کے کسی التفات کا نوٹس نہ لیتا...... ماں اس کے لئے ایک فالتو چیز بن گئی تھی۔شادی کے بعد اس کا نظریہ اپنی ماں کے متعلق بدل گیا تھا۔

''آپ مائینڈ نہ کریں ابو تو ایک بات کہوں''

''کہو..... کہو..... بلکہ ضرور کہو۔ باتوں کو دل میں نہیں رکھنا چاہئے۔ اس سے جزیشن گیپ بڑھتا ہے..... خاص کر بزرگوں پر تو اپنا نکتہ نظر ضرور واضح کرنا چاہئے لیکن احترام کے ساتھ.....''

''بیچاری امی نے میری تربیت ٹھیک نہیں کی۔ انہوں نے مجھے اتنا ٹوکا، اس قدر راہیں بند کیں میری کہ میں آج کی مارڈن مسابقت بھری زندگی کے قابل نہیں رہا۔ شام کو سات بجے گھر آؤ..... نماز پڑھو، روزے رکھو..... ابو کے آگے خبردار بولے..... بڑوں کو سلام کرو..... پلیٹ ٹاف کرو جیسے مکے میں جھاڑو پھیرتے ہیں۔ نہا کر سکولجاؤ۔ کوئی ایک آڈر ہوتا تھا امی کا..... کوئی دوست نہ بننے دیا۔ کوئی رات باہر نہ گزارنے دی..... اب یہ حال ہے کہ کسی نئے ماحول میں جاؤں تو ہاتھوں میں پسینے آجاتے ہیں۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ کوئی کام کروں، لگتا ہے غلط کر رہا ہوں۔ Conecntration کا یہ عالم ہے کہ ادھر بات کرتا ہوں، ادھر بھول جاتا ہوں..... آپ کو کیا معلوم ابو..... کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں مریضوں کو درست دوا بھی لکھ کر نہیں دے رہا..... اس طرح تو میں دس پتی رہ جاؤں گا ابو..... موٹی عینک والا پرچیاں لکھنے والا ہٹی ڈاکٹر..... جس کے خلاف مریض اخباروں میں خط لکھتے ہیں''۔

''لیکن سی ایس ایس کر کے کیا ہوگا..... وہاں بھی تو اتنی ہی تنخواہ ہوگی جہانگیر..... ڈاکٹر اور سی ایس ایس افسر کا ایک ہی گریڈ ہوتا ہے.....''

جہانگیر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں مزید نہ بول سکا۔ میرے اندر ڈاٹ لگ گیا۔

''گریڈ ایک ہی ہوتا ہے ابو، لیکن اتھارٹی سول سرونٹ کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی پاورز کا کیا مقابلہ۔ آپ کو معلوم نہیں ابو، سیاسی لوگوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤں گا۔ شاہدہ کا خیال ہے مجھے سیاست میں جانا چاہئے.....

وہی میرا آخری کیریئر ہوگا..... اصلی طاقت اصلی پاور وہیں ہے....."

ڈنڈوت کے سے انداز میں صوفے پر میں آگے ہوگیا۔ مجھے پرانے ماہ وسال یاد آرہے تھے۔ شاہد بھائی کی دوکان پر بیٹھ کر میں نے آہستہ آہستہ اپنے لئے الیکٹرونک گڈز امپورٹ کرنے کا ایک لمبا چوڑا بزنس تیار کرلیا تھا۔ اس میں کئی پڑاؤ آئے تھے۔ ہال روڈ سے گلبرگ اور وہاں سے ڈیفنس تک کئی ناکامیاں بھی ہوئی تھیں۔ نقصانات بھی سہے تھے، لیکن مجھے اپنی لائن چھوڑنے کا کبھی خیال نہ آیا۔

"تم محنت کرتے چلے جاؤ جہانگیر..... برکت اللہ ڈالے گا"۔

اصغری کی ریاضتیں میری نگاہوں میں گھوم رہی تھیں.....

"ہمیں پاور سے کیا لینا ہے بچہ..... ہم کو سیاسی جوڑ توڑ سے مطلب..... ہم نے کفایت سے گزارہ کیا..... ایک پائی قرض مجھ پر نہیں ہے۔ کبھی پاور کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں آیا..... دیکھ لو کسی سے کم نہیں..... آرام دہ گھر ہے..... تعلیم یافتہ بیٹا بیٹی ہے..... اللہ رسول کا نام ہے اور کسی کو کیا چاہئے..... دنیا بھی ملی اور دین بھی، ترقی بھی ملی اور فلاح بھی۔ ہمارے نبی ﷺ تو دو جہاں کے بادشاہ ہیں، وہ ہمیں بھی دونوں جہان دلواتے ہیں....."

جہانگیر کو لگا جیسے باپ نے اس کے ماتھے میں ڈالا مار دیا۔

"یہ آپ کی سوچ تھی، ابو جس نے مجھے مروا دیا۔ یہی آپ کی قناعت پسندی تھی جس نے مجھ سے میرے ترقی کے خواب چھین لئے..... آپ اور امی تو اتنے قابض تھے میرے جسم پر..... میری روح پر..... کہ میں سانس بھی آپ کو خوش کرنے کے لئے لیتا تھا..... آپ کا بس چلتا تو مجھے روئی میں لپیٹ کر پالتے..... فیڈر سے اب تک..... دودھ پلاتے..... خود نہلاتے..... منہ میں چوسنی ڈالتے اپنے سامنے رکھتے..... ابو..... یہ محبت نہیں ہے جو آپ نے مجھ سے کی..... پر قینچ پرندہ..... ہوں میں زخمی پرندہ..... آپ نے شہباز کے ناخن کاٹ دیئے ہیں اور اب اس سے شکار کرنے کی امید

رکھتے ہیں..... ایسے نہیں چلے گا..... ایسے چل نہیں سکتا..... میں دیوانہ ہو جاؤں گا..... یہ گھر ہے؟ آپ نے گھر دیکھے نہیں..... نہ آپ کا کوئی Exposure تھا، نہ آپ نے مجھے آنکھ کھول کر کچھ دیکھنے دیا ابو..... میں..... بدحواس خبطی ہوں..... میں شاہدہ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا..... وہ ٹھیک کہتی ہے، آپ دونوں بڈھوں نے مجھے Passivity سکھا دی ہے..... میں Fight Back نہیں کر سکتا..... مجھے سی ایس ایس کرنا پڑے گا ابو..... ورنہ میں پیچھے رہ جاؤں گا ہر دوڑ میں.....''

''پیچھے رہ جانے سے تمہاری کیا مراد ہے جہانگیر؟..... ترقی کی دو سمتیں ہوا کرتی ہیں ..... ایک دنیاوی، دوسری روحانی..... ایک مادی ترقی، دوسری فلاح دارین.....''

''آپ شاید سمجھ نہیں رہے ابو..... زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور آپ ابھی گدھے کی سواری میں خوش ہیں۔ یہ رفتار کا زمانہ ہے ابو۔ جو بیٹھ کر سوچتا رہے گا، وہ پیچھے رہ جائے گا۔''

''تمہاری تعلیم اچھی ہے، اگر کوشش کرو تو ایف آر سی ایس بھی کر سکتے ہو..... دیکھتے نہیں، آج کل ڈاکٹروں کی آمدنی کتنی ہے؟..... تم باہر جا کر ابھی بھی اپنی تعلیم بہتر کر سکتے ہو''۔

''ان ڈاکٹروں کی ابو..... جن کے ریسورس ہیں..... جو پرائیویٹ کلینک بنا سکتے ہیں۔ میرے جیسے ڈاکٹر تو مشکل سے ہٹی چلا سکتے ہیں۔ بازار میں دوکان ڈال سکتے ہیں.....''

''شروع شروع بازار میں دوکان چلانا کوئی برائی نہیں جہانگیر.....''

''یہی تو آپ کی مشکل ہے ابو..... نہ آپ سٹیٹس کو سمجھتے ہیں، نہ دولت کو، نہ ماڈرن لائف کو..... آپ ابھی ایک اور عہد میں جی رہے ہیں جہاں دولت ہوتی ہے، لیکن معیار زندگی نہیں ہوتا۔ جہاں سب کچھ ٹھہرے پانیوں کی طرح جامد و ساکت رہتا ہے ..... یہ زندگی ہے، زندگی ہے یہ..... چل کر شاہدہ کے گھر دیکھیں۔ اول بدل، یہ جاوہ آ

..... مصروفیت، سوشل لائف، رفتار..... آپ نے مجھے اور ارجمند کو اردو میڈیم سکول میں پڑھایا۔ ہم نے اقبال غالب کے نام تو سن لئے، لیکن ہمیں وہ گفتگو بھی نہ آسکی جو آج کل اردو میڈیم Elites کرتے ہیں۔ لیکن ہم وہ باتیں بھی نہیں کر سکتے جو اقبال غالب والے کرتے ہیں۔ آپ نے میں نہ سیر و سیاحت کا شوق ڈالا، نہ ہمیں معلوم ہو سکا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سکول سے گھر..... گھر سے کالج..... ہر وقت واپس گھر گھر گھر..... کسی دوست کو گھر نہیں لا سکتے، کسی کے گھر جا نہیں سکتے..... آپ اسے تربیت سمجھتے ہیں۔ آپ سمجھتے تھے میں لڑکی ہوں جسے چادر اور چار دیواری میں بند کر کے آپ درست کر رہے تھے۔ سچ بتائیے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے مجھے یوں لڑکیوں کی طرح پالا؟ کیا آپ نے مجھے شریف بناتے بناتے خصی نہیں کر دیا؟..... مجھ سے میری مردانگی نہیں چھین لی.....؟ میں مرد ہوں؟ مردوں کی یہ ہمت ہوتی ہے۔ مرد ایسے بزدل ہوتے ہیں..... اپنی بیوی سے ڈرنے والے؟"

میں بھی ساری عمر دو کانسے گھر اور گھر سے دفتر جاتا رہا تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ کانٹوں سے محفوظ رہنے، اندر اور باہر کے شر سے پناہ حاصل کرنے کا مجھے اور کوئی طریقہ بھی نہ آتا تھا۔ اسی گر کے ساتھ میں نے جہانگیر کی پرورش کی۔ یہی وہ آخری جنگ تھی جو سعادت مند جہانگیر نے مجھ سے لڑی اور عین اس لڑائی سے تیسری رات جب میں اور اصغری داتا دربار گئے ہوئے تھے، وہ اپنے بیٹے ہارون اور شاہدہ کو لے کر اپنے سسرال چلا گیا اور اسی ایس ایس کی تیاری کرنے لگا۔ داتا دربار سے لوٹے تو اس کا رقعہ ملا۔

"اماں..... میں آپ سے مل کر اس لئے نہیں جا سکتا کہ پھر میں یہ گھر چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ یہاں رہ کر میں سی ایس ایس کی تیاری نہیں کر سکتا۔ آپ کی نگاہیں اور ابو کی باتیں مجھ میں احساس جرم پیدا کریں گی۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔ آپ بھی پلیز ہمیں ملنے آیا کریں..... امید ہے آپ مجھ جائیں گے۔

اس رقعے کے بعد ہم دونوں دیر تک چپ چپ بیٹھے رہے، نہ جانے کیوں مجھے اچانک ارجمند بھی بہت یاد آئی..... ہم دونوں اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ بچوں کی پرورش میں ہم سے کہیں غلطی ہوگئی تھی، ورنہ وہ دونوں ہمارے ساتھ رہنے پر رضامند رہتے۔

مجھ سے قریباً پچیس سو سال پہلے کپل وستو کے راجہ شدودھن نے بھی یوں ہی سوچا تھا۔ وہ گوتم قبیلہ کا راجہ تھا، وہ علاقہ جو آج نیپال کہلاتا ہے، یہاں ہی کپل وستو کے مقام پر اس کی مہارانی مایا نے سدھارتھ کو جنم دیا جو پہلے گوتم پھر سدھارتھ رفتہ رفتہ شاکیامنی اور انتم میں بدھا کہلایا۔ بدھ کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد مہارانی مایا فوت ہوگئی اور سدھارتھ کی پرورش کا ذمہ دار راجہ شدودھن ہی ٹھہرا۔ شدودھن راجہ جو کھشتری تھا اور شاکیامنی تھا، اپنے بیٹے گوتم کے لئے اس درجہ متفکر اور بدحواس تھا کہ اس نے ہر طور کوشش کی کہ پر دکھ درد کے دروازے بند رکھے۔ بڑھاپا، بیماری، موت کے مناظر محل کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ کسی مرجھائے ہوئے پھول کو ٹہنی پر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ کانٹوں کو شاخوں سے اتار دیا جاتا، لیکن زندگی کا منفی Exposure نہ ہونے کے باعث گوتم سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ جس منفی سوچ کو راجہ نے محل سے نکالا تھا۔ وہی سوچ سدھارتھ کے تخیل میں جا بسی۔ شدودھن کی اس خود ساختہ جنت سے بدھا کا دل اچاٹ ہوگیا۔ حضرت آدم کی کہانی ایک بار پھر دوہرائی گئی اور ایک رات سدھارتھ انتیس برس کی عمر میں رانی یشودھرا اور اپنے بیٹے کے پہلو سے نکلا اور جنت کی خوشیوں سے دبے پاؤں غم سے بوجھ زندگی کی تلاش میں نکلا۔

بدھا جاننا چاہتا تھا کہ کس طرح دکھ کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے، دکھ کا حاصل کیا ہے اور دکھ انسان کی زندگی میں کہاں کہاں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آٹھ سال دو برہمنوں کے آگے دست بستہ ٹریننگ لیتا رہا..... لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ چھ سال اس نے اپنی ذات کو شدید مجاہدات کے حوالے کیا..... لیکن پھر اس پر صرف اتنا عرفان ہوا کہ زندگی کی راحت فقط درمیانی راستہ اختیار کرنے میں ہے۔ منفی

اور مثبت کے درمیان میں دکھ اور خوشی کے وسط میں..... اس کے باپ شدودھن پر محل میں کیا گزری؟ یہ دوسری کہانی ہے..... یشودھرا اور بچے نے گیا کے درخت تلے نروان حاصل کرنے والے کا کیسے انتظار کیا۔ یہ تیسری کہانی ہے، جس پر لوگوں کی توجہ اس لئے نہیں جا سکی کہ جو لوگ انسانیت کے لئے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ ایسے ہاتھیوں کے پیروں تلے کچھ بونے، ادنیٰ رسومات، ناکارہ مسلک، پس بھی جاتے ہیں، لیکن پھاوڑا جب دھرتی کا کلیجہ پھاڑ کر نئی فصل کاشت کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو اسے علم نہیں ہوتا کہ زیر زمین بسنے والے کیڑے مکوڑے، جڑی بوٹیاں، گھاس پھوس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہی ارتقاء لانے والے بڑے آدمی کی قسمت اور چھوٹی مخلوق کی قربانی ہے، جس کے تحت بنی نوع انسان آگے سے آگے، آگے سے اور آگے ارتقاء کرتا چلا جاتا ہے..... اور اسی ارتقاء کے سہارے ابد کی جانب اور آگے بڑھتا ہے۔

مجھ بگی داڑھی والے راجہ شدودھن کا کمرہ اوپر والی چھت پر تھا۔ جن دنوں شاہدہ ہمارے پاس تھی، وہ کبھی کبھی ہمارے پاس خیر خیریت دریافت کرنے چلی آتی اور مماس کی طرح ہمارے دائرے کو چھو کر نکل جاتی۔ اوپر والے دو کمروں کے سامنے چھوٹا سا ٹیرس تھا، جس کے سامنے رواں دواں سڑک تھی۔ میں لوہے کی آرام کرسی میں دھنس کر اسی ٹیرس سے سڑک کا منظر دیکھتا رہتا۔ یہیں بیٹھ کر مطالعہ کرتا، اخبار پڑھتا اور یہاں ہی ورزش کے طور پر چلا بھی کرتا تھا۔ مجھے ایک عرصہ سے کبھی بس پر سفر کرنے کا موقع نہ ملا۔ لمبی سیاہ گاڑی پر دوکان سے گھر اور گھر سے دوکان جاتے آتے احساس نہ ہوا کہ بزنس ختم کرنے کے بعد یہ آسائش بھی زاید ہو جائے گی۔ میں نے ساری زبنس گول کر دی تھی۔ اب مجھے مزید بھاگ دوڑ کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کبھار پرانے دوست یا رشتہ دار ملنے آ جاتے تو وہ اسی ٹیرس پر بیٹھ کر چلے جاتے۔ ان لوگوں کے بھی تیز رفتار زمانے میں بہت سے مسائل تھے۔ اس لئے یہ بھیڑ بھی جلد

چھوٹ گئی اور میل ملاقاتی اپنے مسائل میں گم ہو گئے ..... یہ بہت بہت پہلے کی بات ہے۔

شاہدہ جوس پیتی ہوئی اوپر والی منزل پر آئی۔ ابھی جہانگیر شاکیا منی ہم سے رخصت نہ ہوا تھا۔ میں چھوٹے میز پر شیشہ لگائے الیکٹرک شیور سے خط بنانے میں مصروف تھا۔

''آسکتی ہوں جی''

''آیئے آیئے زہے نصیب بسم اللہ .....'' شاہدہ نے میز پر رکھا ہوا آئینہ ٹشو سے صاف کیا۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ شاہدہ کیا مجھے سلام کرے گیا نہیں؟ سارے میں پائین ایپل کی خوشبو پھیل گئی۔

''آپ یہاں بیٹھ کر شیو کرتے ہیں'' شاہدہ نے سلام کے بغیر گفتگو کا آغاز کیا۔

مجھے اپنے اس فعل پر کچھ شرمندگی کا احساس ہوا۔

''یہاں ذرا روشنی زیادہ ہے.....'' اب عینک کے نمبر ختم ہو چکے تھے اور میں لنز لگا کر اخبار پڑھنے لگا تھا۔

ٹشو سے کرسی صاف کر کے شاہدہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر پائین ایپل کا جوس پینے کا شغل جاری رہا۔

''وہ ایک بات کرنا تھی آپ سے ..... جہانگیر تو ہرگز معاملہ آپ کے سامنے پیش نہیں کرے گا''۔

''ہاں ضرور.....'' مجھ کو اپنی اہمیت کے احساس نے سیدھا بٹھا دیا۔

''ہم لوگ امی کی طرف شفٹ کرنا چاہ رہے ہیں.....''

میں نے بہت سی باتیں پوچھنا چاہیں۔ کیوں؟ کس لئے؟ کتنے عرصے تک ..... لیکن سارے سوال دل میں چھپا کر میں خوش دلی سے بولا.....''

ہاں ہاں کیوں نہیں..... کیوں نہیں"

"یہ میں جہانگیر سے کہہ رہی تھی کہ ابو کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ تمہاری طرح Unreasonable نہیں ہیں....."

اس تعریف کو میں نے غنیمت جانا اور خاموش رہا۔

"ویسے میں ایک بات پوچھوں..... آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟"

"نہیں نہیں پوچھو..... پوچھو....."

"یہ جہانگیر کو آپ نے کیسے پالا ہے؟ میں سمجھ نہیں سکی۔ اس قدر Sissy آدمی ..... آپ مرد پال رہے تھے کہ لڑکی..... چوڑیاں پہنا دیں، دوپٹہ پہنا دیں اسے..... کسی سے سیدھی بات نہیں کر سکتا، ہکلانے لگتا ہے..... Confidence نام کی کوئی چیز نہیں اس میں..... آپ نے جہانگیر کو لائف کے قریب نہیں ہونے دیا، کچھ Face نہیں کرنے دیا He has no Confidence..... اگر یہ یہاں رہا تو سی ایس ایس نہیں کر سکے....."

میں نے کہنا چاہا کہ اسی گھر سے تمہارے جہانگیر نے ایم بی بی ایس کیا تھا، لیکن چپ رہا۔ ہر شدو دھن کو چپ رہنے کا حکم ہے۔

"اچھا جی..... کوئی Hard Feelings کے بغیر ہی کام بن جائے تو اچھا ہے۔ بس جہانگیر کا کام تو اتنا ہے جو ہو چکا اس پر بھی خوفزدہ..... جو ہو رہا ہے اس سے بھی ڈرے ہوئے اور جو ہونے والا ہے اس سے تو مائی گوڈ۔ اتنے Scared کہ جان ہی نکلی جاتی ہے....."

وہ بغیر اضافی جملوں کے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ صرف ایک پھڑ پھڑاتا ہوا نشو اس کی نشانی میز پر رہ گیا۔ جانے سے کچھ دن پہلے ڈرائنگ روم میں زبردست ہنگامہ بھی ہوا تھا.....

میں بارہ کھلنے والی کھڑکی کے سامنے لانمیں بیٹھا تھا، لیکن پردے کھنچے تھے، اس لئے

اندر والوں کو احساس نہ ہوا کہ آواز باہر بھی جا سکتی ہے۔شاہد نے گرج کر کہا..... ''جب میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے ابو جی کو انفورم کر دیا ہے تو اب تمہیں فارمل اجازت لینے کی کیا مصیبت ہے..... یہ کوئی سرکاری تبادلہ ہے کہ فارمل اطلاع دینا ہو گی''۔

''امی ابو اس بڑے گھر میں بالکل تنہا رہ جائیں گے، شاہدہ This is not fair

''

ڈاکٹر جہانگیر نے منمنا کر جواب دیا.....

''اور یہ میرے ساتھ فیئر ہے؟ میں ایک ایکڑ کی کوٹھی چھوڑ کر اس چار کنال کے ڈربے میں آئی۔میرا خیال تھا کہ تم جلد کوئی انتظام کرو گے، لیکن تم جیسے چکن ہارٹڈ لوگ خود بھی پستے ہیں اور دوسروں کو بھی پسنے کا حکم لگا دیتے ہیں۔تمہارے نزدیک یہ Idealism ہے۔مائی فٹ.....''

''میں کب کہتا ہوں کہ میں Idealism کا شکار ہوں.....''

''میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں ساری چالیں..... انگور کھٹے ہوں تو آدمی نیک بن جاتا ہے۔تم جیسے لوگوں کو اگر دولت، سٹیٹس اور موقع ملے تو تم نہ جانے کیا کیا کرو..... نمبر ون لچے بدمعاش نکلو..... تمہارا ہاتھ ہی نہیں پڑتا، اس لئے تم نے نیکی کی وردی پہن رکھی ہے..... تم یہاں رہے تو جہانگیر میں تمہیں چھوڑ دوں گی..... یہ جگہ میرے لئے گالی ہے..... ان کمفرٹیبل ہے..... میں قربانی تو دے سکتی ہوں، لیکن ساری عمر قربانی کا بکر نہیں بنی رہ سکتی..... انسان ایک بار پیدا ہوتا ہے، ایک بار زندگی گزارتا ہے۔"Life is for once only"

منمنا کر جہانگیر نے کچھ جواب دیا۔

''بلڈی شٹ..... تم اپنے ماں باپ کے لئے Considerate ہو اور میرے لئے..... میرے بچے کے لئے؟..... تم کو علم ہی نہیں میں یہاں کس طرح Suffer کر رہی ہوں۔تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو باسٹرڈ؟ تمہارے پاس ہے کیا دینے کے

لئے ایک سیکنڈ ہینڈ سوزوکی کار..... یہ Bitchy ہاؤس، ایک نالائق کک..... ایک ہاف بیکڈ باپ..... ایک پاگل ماں..... یہ سب کچھ دینے کے لئے تم نے شادی کی تھی مجھ سے..... میں نے تمہاری خاطر اپنی ممی ڈیڈی کا دل توڑا..... ساری فرینڈز چھوڑیں۔اس ڈرٹی کچن ہول میں آکر انہوں نے میرا ہی مذاق اڑنا تھا ناں۔اتنی ساری قربانی کا یہ صلہ دیا تم نے جہانگیر.....؟تم اتنا بھی ریلیز نہیں کرتے کہ اس Un hygeinic جگہ میں میرا بچہ نہیں پل سکتا..... میں.....کوئی فرشتہ نہیں ہوں کہ تمہاری ہر بات مان لوں گی..... کچھ باتیں تمہیں بھی ماننا ہوں گی جہانگیر.....ایک بڈھے پھوس جوڑے کی خاطر ہم اپنی زندگی کا پیٹرن برباد نہیں کر سکتے ہاں۔"

جہانگیر اور شاہدہ کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں پھر اوپر والی چھت سے اتر کر نیچے آبسے، لیکن ہماری زندگی کا پیٹرن بالکل نہ بدلا۔ہم پہلے بھی بغیر پانی کے پھول تھے اب بھی ماہی بے آب بن کر وقت گزارتے رہے۔صرف اتنا ہوا کہ میرے سامنے والے سارے دانت یکے بعد دیگرے ٹوٹ گئے اور مجھے علم نہ ہو سکا۔اب نہ مجھے نام یاد رہتے، نہ لوگوں کے چہرے دیکھ کر کوئی شناخت ابھرتی۔پل بھر پہلے کا واقعہ ذہن سے محو ہو جاتا۔صرف پرانی یادیں گھیرا ڈالے بیٹھی رہتیں۔ جہانگیر کا بچپن، اصغری کی جوانی، ارجمند کا چہرہ، جوانی میں رخصت ہو جانے والا باپ اور بہن بھائی .....جن کو زندگی کھا گئی یا میری ترقی اور پھر اقبال.....ایک واہمہ، ایک خواب، پرانے گھر، سکول میں ہونیوالے واقعات چھوٹی چھوٹی باتیں جنہوں نے انہونی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ماں گویا زندہ اور جاندار ہو کر میرے انتظار میں رہتا۔گھنٹوں چھوٹی سی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر پھاٹک کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بسوں کو دیکھتا رہتا۔بظاہر بچوں کے لوٹ آنے کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کا انتظار نہ رہتا۔شاید میں موت سے خائف تھا، اسی لئے ماضی میں پناہ لیتا تھا۔شاید میں خوشی کے معجزے کا انتظاری تھا جو اب نامکمل تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ انتظار مہینوں کا ہے کہ سالوں کا..... کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے..... ہمیشہ دل نے کہا..... عقل کہتی رہی کچھ ہونے کو باقی نہیں رہا۔ اب اور کیا ہوگا..... سزائے موت..... لیکن ایک بات میری سان وگمان میں نہ تھی کہ اصغری بھی بچھڑ سکتی ہے۔ وہ سلیپروں میں کھڑ پڑ کرتی، گھر کے ساز وسامان کو چیتھڑوں سے صاف کرتی۔ اپنے دونوں بچوں کی رخصتی کے بعد ایک سایہ سا گھومتی پھرتی موجود تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی مجھے انتظار رہتا، کچھ بدل جانے کا..... اچانک بہار کے آنے کا..... شاید اقبال کا؟..... بہر کیف ایک اندھی سی شام کو بغیر اطلاع کے جہانگیر وارد ہوگیا..... اصغری کی موت کے بعد میں جہانگیر سے ملنے نہیں گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا کہ سسر کی فیکٹری میں حلول کر گیا۔ پوتے کی یاد کبھی کبھار آتی تھی، لیکن میں نے اس یاد کو بھی اسی الماری میں ہینگر پر لٹکا کر رکھ دیا، جہاں اور بہت سی استری شدہ یادیں کپڑوں کی صورت پہنے جانے کی منتظر تھیں۔ ملازم چھٹی پر تھا۔ میں چائے کی پیالی بنا کر ڈرائنگ روم میں آرہا تھا، جب جہانگیر دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ دروازہ کھلنے پر نظر آیا کہ جہانگیر کی گاڑی بڑی تھی اور اسے ڈرائیور چلا کر لایا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے دل میں شکر کیا کہ شام کا اندھیرا تھا اور ابھی میں نے بتی نہیں جلائی تھی۔ ایک شہر اور اتنے لمبے فاصلے.....

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں ابو'' جہانگیر نے باپ کے ہاتھ سے پیالی پکڑ کر تپائی رکھی۔

''چائے پینے لگا تھا۔ پیو گے''

''اور وہ کہاں ہے غلام نبی''

''وہ سوات گیا ہے چھٹی پر.....''

''کب آئے گا''

''پرسوں آجائے گا۔ پندرہ دن کی چھٹی پر گیا تھا.....''

''آپ اتنی لمبی چھٹی نہ دیا کریں اسے..... امی کے بعد آپ کو کون لک آفٹر کرے

گا''۔اس کی آواز میں احساس جرم تھا..... سعادت مند بیٹے کا احساس کم مائیگی۔

''ہاں..... تم ٹھیک ہو.....''

''جی.....''

''اور بے بی کہاں ہے؟.....'' مجھے یاد نہیں تھا کہ کا بے بی اصلی نام ہارون ہے۔

''میں آپ کو کچھ بتانے آیا تھا۔''

''ہاں..... ہاں ضرور.....''

جہانگیر نے اٹھ کر کمرے کی بتیاں روشن کر دیں.....

''میں نے فیصلہ کیا ہے..... میں امریکہ چلا جاؤں..... یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے اور میں نے کمپیوٹرز میں ایم سی ایس کر لی ہے.....''

لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، وہ سی ایس ایس کرنے کے لئے شاہدہ کے گھر منتقل ہوا تھا۔ جب تک اصغری رہی، ہم کبھی کبھی ان دونوں سے ملنے جاتے بھی رہے، لیکن ہماری معلومات جہانگیر کے معاملے میں ہمیشہ ناکافی رہیں۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ کبھی اس نے مجھ سے کمپیوٹر کا ذکر کیا ہو۔

میں نے روشنی میں اپنے ڈاکٹر بیٹے کو دیکھا۔ وہ اب کسی فیکٹری کا چیف ایگزیکٹو لگ رہا تھا۔ ڈاکٹری اور سرکاری افسری اس کے قریب قریب کہیں نہ تھی۔

''لیکن تم تو یہاں سے سی ایس ایس کرنے گئے تھے جہانگیر.....''

''بس ایسے ہی ہے ابو..... وہاں میرے سسر نے مجھے اپنی فیکٹری میں جگہ دے دی۔ امتحان نہ دے سکا میں۔''

''اچھا..... اچھا کیا چھوڑ دیا امتحان''۔

''نہیں ابو..... اب میں خود اعتماد مرد بن گیا ہوں..... میں کسی کارخانے دار کی پلیٹ سے لے کر نہیں کھا سکتا۔ مجھے اپنا مستقبل..... اپنے بچے کا مستقبل خود بنانا ہے..... میں ان لوگوں کا دست نگر نہیں رہ سکتا۔ اگر شاہدہ کے لئے یہاں رہنا مشکل تھا تو

میرے لئے بھی وہاں زندگی کچھ آسان نہیں..... میری غیرت کے بھی کچھ تقاضے ہیں آخر۔"

میں نے ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھر کر اسے دیکھا..... "لیکن امریکہ کی زندگی تو بہت مشقت طلب ہے ..... شاہدہ اتنی اوکھی زندگی بسر کرلے گی..... وہ تو نازوں میں پلی ہے۔ پانی بھی اٹھ کر خود نہیں پی سکتی....."

"اب اس کے لئے کوئی چوائس نہیں ہے ابو، فیکٹری چلا کر میں بھی بندوں کو چلانا سیکھ گیا ہوں"۔

"یہاں سسرال میں ہم دونوں کی کوئی عزت نہیں۔ وہ بھی اب ریلیز کرتی ہے۔ یہ اسی کا فیصلہ ہے کہ ہم باہر چلے جائیں اور اپنی زندگی خود بنائیں اسے بھی شوق چڑھا ہے..... وہ بھی ارجمند کی طرح Independent ہونا چاہتی ہے"۔

جب میں جہانگیر کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس لوٹا تو مجھے پتہ چلا کہ اتنے بڑے شہر کی اداسی کیا ہوتی ہے اور رونق کے دل میں تنہائی کا چٹاخ کیسے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ امریکہ سدھارنے سے پہلے کبھی کبھی جہانگیر مجھے فون کر دیتا تھا۔ دو مرتبہ عید کے موقع پر شاہد بے بی کو بھی لے کر آئی، لیکن بچہ دادا کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھا نہ سکا۔ اسے باہر کی چیزیں کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک دفعہ میں نے آئس کریم والے سے قلفی لے کر بے بی کو دی تو ہارون نے للچائی نظروں سے قلفی کو دیکھا اور پھر لوٹاتے ہوئے کہا ..... "دادا مجھے Allowed نہیں ہے۔"

جہانگیر نے جلدی سے قلفی بچے کے ہاتھ سے اچک لی اور بولا..... اپنے بیٹے کو کھلاتے نہیں اور پوتے کی خدمت ہو رہی ہے..... ساری زندگی آپ نے مجھ سے سوتیلے بیٹے کا سا سلوک کیا۔ شاہدہ اور بچہ ابلا ہوا پانی پیتے تھے، اس لئے بازاری پانی کی الگ بوتل بھی ساتھ آتی۔ میں انہیں اپنے نل کا پانی بھی پلا نہیں سکتا تھا..... نام بھی شاہدہ کے والدین نیر رکھا تھا، اس لئے مارے انا کے میں بھی نام نہ سیکھ سکا اور بچے کو بے بی ہی بلا

رہا.....

کپل وستو کے محل میں مہارانی مایا نے جب گوتم کو جنم دیا تو راجہ شدودھن کو علم نہ تھا کہ بیٹے کی پرورش کیوں کر اور کیسے کی جاتی ہے؟ راجہ شاکیا قبیلہ کا سردار رہا تھا۔ اسے حکومت، سیاست اور ظلم کا علم تو ضرور تھا، لیکن پرورش، مہربانی اور آنسوؤ کی تاثیر سے وہ نابلد تھا۔

مرنے سے پہلے مہارانی مایا نے شدودھن کی گود میں سدھارتھ کو دے کر کہا ..... ''راجہ جی اس کا منہ تو دیکھئے بھلا..... یہ چت چور تو بڑے گہرے دھیان میں لین ہے..... اس کا من کیسے لگے گا؟ اس سنسار میں''۔

''تم اپنی چنتا کرو مہارانی جی۔ اس بالک کی اور مت دیکھو.....''

لیکن مہاں مایا کو اپنا دھیان نہ تھا..... مہاراج ادھیراج یہ سنتان کبھی کشٹ نہ اٹھائے ..... میں جیتی رہتی تو اس کے منہ سے یہ ساری چنتا ہرن کر دیتی، پر اب یہ بالک آپ کے شرن ہے۔ اسے کشٹ اور اداسی سے بچائے گا ورنہ میری آتما''۔

راجہ کی ممتاز محل جاتے جاتے جملہ ادھورا چھوڑ گئی ..... پر راجہ راج پاٹھ کے چلن بھول گیا..... اب اسے ایک ہی کارگزاری سے غرض تھی کہ بہت سوچنے اور دھیان کرنے والے چہرے پر اداسی کی چھاپ نہ ہو..... گوتم کشٹ بجھیلے، نہ اندر نہ باہر..... گیان دھیان کی چنتا کسی طرح گوتم کے چہرے کی پرچھائی نہ بنے۔

مرنے سے پہلے اصغری بولی۔ ''ہمایوں صاحب آپ بڑے بھولے اور سیدھے آدمی ہیں۔ میں نے ساری عمر بچوں کی تربیت کا بوجھ آپ پر نہیں ڈالا۔ لیکن اب بیچ منجدھار جانا پڑے گا۔ مجھے نظر آرہا ہے..... جہانگیر کا اپنا کوئی اس کے قریب نہیں۔ آپ کے گھر والوں نے تو کوئی رشتہ نبھانے کی کوشش نہ کی۔ سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے۔ ارجمند پہلے سے امریکہ زادی ہوگئی ہے اب جہانگیر بھی سسرال جا بسا ..... برسوں ادھر میرا مائیکہ بھی چھوٹ کر کراچی جا بسا..... اب آپ ہی آپ ہیں.....

جہانگیر بڑا صابر اور حساس ہے۔ دل کی بات کو زبان پر آتے آتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کی خاموشی کو نہ سمجھے تو قیامت آجائے گی ..... وہ ..... اپنی کسی خواہش کا اظہار تو کرنے والا نہیں ..... بس اسے اداسی سے بچایئے گا۔ میں ہوتی تو ..... ''قدرت نے اصغری کو نہ تو اپنا پنتھ نبھانے دیا، نہ ہی دکھڑا ہی بیان کرنے کی خوش بیان دی۔ ''لیکن میں بھی کیا کر لیتی بھلا۔ آپ ہی آپ ہیں اب تو .....''

اصغری کی ساری خواہشیں بھی اس کی باتوں کی طرح ادھوری تھیں جیسے اس کی پوری بات سن کر جواب دینے والا کوئی تھا ہی نہیں ..... اس ادھوری عورت نے جانے میں بھی عجب بے تکا پن دکھایا.....

ہم باپ بیٹا ڈائیلاگ تو قائم نہ کر سکے، کیونکہ وہ امریکہ میں تھا، لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا پل تعمیر ہو گیا تھا جو ٹیلی پیتھی کے سہارے چلتا تھا۔ فون پر جتنی باتیں ہوتیں وہ غیر ضروری ہوا کرتیں۔ ہم اندر کے حالات زیر بحث نہلا سکتے۔ بہن کی نقل میں یا اپنی آزادی کی تلاش میں جہانگیر بھی امریکہ چلا گیا۔ اسے بھی شاید کسی بودھی درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے بیٹھ کر وہ راحت اور غم دونوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا۔ امریکہ میں اسے کمپیوٹرز کی ایک بڑی کمپنی میں بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ شاہدہ اس تبدیلی پر خوش تھی اور بالآخر اسے آزاد چلن کی ویسی زندگی مل گئی، جس کی وہ ہمیشہ سے آرزومند رہی۔ جہانگیر کیفون باقاعدگی سے آتے، لیکن ڈاکیہ کبھی کوئی پریم پتر نہلایا۔ میں جانتے بوجھتے ہوئے ہر روز ڈاکیے کا انتظار کرتا رہتا۔ کبھی کبھی لفافے میں ہارون کی تصویریں مل جاتیں تو میں ان تصویروں کو تکیے تلے رکھ کر بار بار نکالتا، دیکھتا اور پھر رکھ دیتا..... خالی کمروں میں گھومتے رہتا، کئی بار پڑھے ہوئے اخبار کو پھر پڑھنا ..... بازار جا کر سب کچھ بھول جانا، درختوں سے زرد روپتے گرتے دیکھنا، پرندوں کی آواز پر کھڑکی کھول کر پرندوں کو عقابی نظروں سے تلاش کرنا، ملازم کو اپنا خدا سمجھنا، سردیوں میں جرابوں اور سویٹر سمیت سونا اور گرمیوں میں کھانسی کے اندیشے سے بغیر

ایئر کنڈیشنر کے رات بسر کرنا، عبادت میں دل لگانے کی ناکام کوشش اور مسجد میں نماز ادا کرنے کو اہم تو سمجھتا..... لیکن ایسا تواتر سے کر نہ سکنا۔ نہ جانے کیوں رفتہ رفتہ ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ رشتہ دار سب راستوں میں کھو گئے یا میں نے ان کا تعاقب بھی سلیقے سے نہ کیا۔ زندگی لوگوں سے اور کام سے خالی ہو کر بنجر ہو گئی..... کچھ تو جہانگیر کی یاد کا جھکڑ اس صحرا پر اڑائے پھرتا۔ کچھ ارجمند کو پرایا مال سمجھ کر بھولنے کی کوشش میں دن کٹتے۔ پھر خالی خولی ہو کر کہیں نہ کہیں بیٹھ رہنے کو پرانی یادوں کو کان لگا کر سننے میں وقت گزرنے لگا۔

پتہ نہیں یوں کتنے سال گزرے..... میرا وقت اب کیلنڈروں کا تابع نہ رہا تھا۔ میں موسموں اور واقعات کا سہارا لے کر بھی اپنے وقت کی بانٹ نہ کر پاتا۔ اب تو رب کیوقت کی طرح میرے ماہ و سال بھی آپی آپ گزرنے لگے۔ پھر اچانک ایک دن جہانگیر وارد ہو گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو سوٹ کیس اور ایک بیگ تھا۔ شاہدہ اور ہارون ساتھ نہ تھے۔ لمبے سفر کی تکان نے اس کے چہرے کو اور بھی اداس کر رکھا تھا۔ ہم دونوں میں خاموشی، تنہائی اور ان کہی محبت کا گہرا حجاب تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور رسمی باتوں کا آغاز کیا..... کچھ دیر کے بعد یہ باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ کوئی راستہ دل کی اندھیری غار میں نہ اترا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چھپتے، شرماتے اور کتراتے سے رہے۔

''شاہدہ کا کیا حال ہے؟.....'' کوئی دسویں مرتبہ اندر کے باپ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے..... ہوا مریکہ میں بہت خوش ہے۔ جس طرح کی آزادی اسے درکار تھی مل گئی ہے۔ نہ سسرال، نہ مائیکا۔ سارے جنجال ختم''۔

''لیکن وہاں تو کام بہت کرنا پڑتا ہے.....''

جہانگیر مسکرایا۔ پھر بولا۔'' کام تو ہم دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔ میں برتن دھو دیتا ہوں، وہ واشنگ کرتی ہے.....''

''ابو جی..... امریکہ میں ہر کام برابر ہے۔ مرد عورت کی کوئی تمیز نہیں..... کام کام ہے..... چاہے پرائم منسٹر کا ہو یا ٹرک ڈرائیور کا.....''

''اچھا اچھا.....'' میری سمجھ بوجھ پرانی تھی۔ میں پرانی روایات کو اتنی آسانی سے بھول نہیں سکتا۔ مشرق میں ابھی مرد اور عورت کی دنیا اس قدر گڈمڈ نہ ہوئی تھی۔ دونوں کے رول اور کام کافی حد تک Defined تھے۔ امریکہ میں یونی سکیس کی تیاریاں شروع تھیں۔

''بس Gloves پہن لیتا ہوں..... ایپرن سجا لیتا ہوں۔ میرے ایپرن پر ابا جی آئن سٹائین کی تصویر بنی ہے..... میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے آپ یاد آجاتے ہیں''۔

آئین سٹائن کی تصویر ایپرن پر؟ کبھی کبھی اپنے آپ کو عزت بخشنے کی خاطر..... لوگ بے ادبی کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں..... بڑے ناموں کو چھوٹے مقاموں پر استعمال کر کے بے حرمتی کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے جناح بوٹ ہاؤس، لنکن بار بر شاپ، اقبال ٹی ہاؤس وغیرہ.....

''اور بے بی.....؟'' میں نے دانستہ ہارون کا نام استعمال نہ کیا۔ مجھے ابھی تک نہ بھولا تھا کہ پوتے کا نام رکھنا دادے کا آبائی حق ہے اور شاہدہ کے گھر والوں نے مجھے اس اعزاز سے محروم رکھا تھا۔

''وہ تو بے حد خوش ہے ابا..... نہ اسے شاہدہ کی پرواہ ہے نہ میری..... سکول سے آکر انٹرنیٹ..... پھر ہوم ورک.....''

''اسے اپنا سکول پسند ہے جہانگیر؟.....'' حیرانی سے میں نے سوال کیا۔

''پسند؟..... اسے تو سکول سے عشق ہے عشق..... خود بستہ پیک کرتا ہے، خود تیار ہوتا ہے..... خود سکول بس کے لئے وقت پر چلا جاتا ہے.....''

میں سراسیمگی کے عالم میں سوچتا رہا کہ وہ کیسا سکول ہوگا جس کے لئے ہارون خود تیار ہوتا ہے..... آپی بس پکڑتا ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شاہدہ کی کال

تھی۔ وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے..... جہانگیر اسے سارے سفر کی تفصیلات بتاتا رہا۔ نہ جانے کیوں اس نے مجھ سے اس کا ذکر نہ کیا..... میں اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا اور جہانگیر کے لئے کافی پھینٹنے میں مشغول ہو گیا.....

دس بارہ دن میں اسی کوشش میں رہا کہ جہانگیر کو کے ایف سی، میکڈونلڈ، پیزا ہٹ اور چائنیز کھانا کھلاؤں۔ میں جہانگیر کو سمجھانا چاہتا تھا کہ اب پاکستان پسماندہ نہیں رہا۔ ہم نے اتنی ترقی ضرور کر لی ہے کہ اپنے شہر میں پیزا ہٹ، تھائی فوڈ، بروسٹ، میکڈونلڈ موجود ہیں۔ جہانگیر گھوم پھر کر غلام نبی سے فرمائش کرتا کہ اسے کڑھی، سرسوں کا ساگ، نہاری، ہریسہ، کنا اور شب دیگ کے ساتھ ساتھ مکئی کی روٹی، پراٹھے اور قیمے والے نان پیش کئے جائیں۔ وہ ایک ہی ہلے میں فرنی کی کئی کئی ٹھوٹھیاں، بازاری قلفیاں، کھیر کھا لیتا۔ کشمیری چائے پر تو اس کی جان نکلتی۔ ہر کھانے کے بعد باورچی خانے میں پہنچ کر لجاجت سے استدعا کرتا..... ''ایک پیالی کشمیری چائے مل جائے گی؟ جناب غلام نبی صاحب.....'' ہم باپ بیٹا ایک دوسرے سے دور دور رہ کر ایک دوسرے میں بس رہے تھے۔ ایک رات جب کشمیری چائے سے اٹھنے والی بادام کی خوشبو سارے میں پھیلی، جہانگیر نے کہا..... ''ابا جی..... ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ امریکہ شفٹ ہو جائیں''۔

''ہماری کہ..... تمہاری.....'' میں سرد مہری کے پچھلے تجربے میں ابھی غوطہ زن تھا۔

''ایک ہی بات ہے ابا جی..... آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہارون اور شاہدہ خوش ہوں گے''۔

''لیکن کیوں.....؟ کیوں خوش ہوں گے''۔

''میں..... وہاں آپ کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا..... پتہ نہیں کیوں جب میں لمبے راستوں پر ڈرائیو کرتا جاتا ہوں تو آپ مجھے ان خالی کمروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں..... میں تو آپ کا تصور اماں کے بغیر نہیں کر سکتا''۔